قسط:۲۱

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

چنیوٹ میں تحریکِ ختمِ نبوّت:

جب لائل پور کی جامع مسجد کچہری بازار کو سیل کر دیا گیا اور شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تو تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ ایسے میں، میں چنیوٹ چلا آیا جہاں پر تحریک اپنے پورے جوش وخروش کے ساتھ جاری تھی۔ میں نے اُسی جذبے کے ساتھ تحریک میں کام شروع کر دیا جس جذبے کے ساتھ میں لائل پور میں کام کرتا رہا تھا۔ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کی گرفتاری میرے سامنے ہوئی وہ اُن دنوں اپنی جوانی میں قدم رکھ رہے تھے۔ اور انہوں نے گرفتاری سے پہلے دین اسلام میں عقیدہ ختمِ نبوّت کی اہمیت اور قادیانیت کے خلاف ایک مؤثر تقریر بھی کی تھی۔ تقریر کے دوران سننے والوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ فضا ختمِ نبوّت زندہ باد اور اللہ اکبر کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ چنیوٹ پہنچنے کے بعد جب میں نے دن رات تحریک میں رضا کاروں کے ساتھ کام کیا تو شہر کی پولیس نے مجھے اور میرے ایک اور نوجوان ساتھی کو گرفتار کرنے کے لیے چھاپے مارنے شروع کر دیے، میرا ساتھی تو پکڑا گیا اور اسے جھنگ جیل بھیج دیا گیا۔ میں اس سلسلے محتاط تو تھا لیکن گرفتاری دینے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ کیونکہ تحریک کی قیادت کی جانب سے لائل پور میں ہمیں کہا گیا تھا کہ رضا کار گرفتاری کے لیے اپنے آپ کوشش نہ کریں۔ بلکہ باہر رہ کر تحریک کے لیے کام کریں۔ اس سوچ میں دن رات گزر رہے تھے کہ ایک دن دو چار سپاہی گھر پر آ گئے اور مجھے گھر سے باہر آنا پڑا۔ نیچے بازار میں آیا تو پولیس نے کہا کہ تھانے چلو میں نے کہا کہ تھانے کیوں جاؤں۔ کہنے لگے کہ تھانے دار کو تمہارے ساتھ ایک کام ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ اگر اُسے میرے ساتھ کام ہے تو پھر اُسے میرے پاس آنا چاہیے، مجھے تو اس کے ساتھ کوئی کام نہیں ہے میں کیوں تھانے جاؤں۔ اُنہوں نے کہا کہ تمہاری گرفتاری کے لیے کہا گیا ہے ہے۔ میں نے کہا کہ وارنٹ گرفتاری دکھاؤ، کہنے لگے کہ گرفتاری کے وارنٹ تو نہیں ہیں شاید وہ تمہیں وارننگ دینا چاہتے ہوں۔ میں نے کہا میں وارننگ مسترد کرتا ہوں۔ جب ہم یہ باتیں کر رہے تھے تو دکان دار جو سبھی احرار کے معاون تھے انہوں نے مداخلت کر کے پولیس والوں کو بھگا دیا۔ اس واقعے اور اس جیسے دیگر حالات کی بنیاد پر میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں چنیوٹ چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں اپنی خالہ کے پاس ایک گاؤں میں چلا گیا۔

زندگی کے پریشان ترین دن:

گاؤں میں تقریباً ایک ماہ تک روپوش رہا۔ حالات معمول پر آ گئے تو گھر فیصل آباد آ گیا۔ اُن دنوں ہم فیکٹری ایریا میں لال ملز کے ایک کوارٹر میں مقیم تھے، گھر آیا تو والد صاحب مجھ سے پوچھتے کہ اب تم کیا کرو گے۔ تم نے تو اپنا مستقبل تباہ کر دیا ہے۔ پہلے تم نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا پھر تم ''مائی گریشن'' کر کے زرعی کالج چلے گئے اور اب تم گھر میں آ کر بیٹھ گئے ہو۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ میں خود انتہائی پریشان تھا۔ کالج چھوٹ چکا تھا۔ اب کیا کروں والد صاحب نے تحریک کے دوران تو مجھے کچھ نہ کہا بلکہ وہ خود تحریک کے دوران گھنٹہ گھر جا کر تقریر کر لیا کرتے تھے لیکن تحریک کے بعد میرا یوں گھر پر بیٹھ جانا انہیں پسند نہیں تھا اس لیے وہ دن رات میری سرزنش کرتے رہتے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں گھر میں فارغ نہ بیٹھا رہوں اور عملاً کچھ کروں۔ مگر میں کیا کروں اس کی مجھے بھی کوئی سمجھ نہ آتی تھی۔ دن رات اسی سوچ میں متفکر رہتا تھا کہ نہ پڑھ سکوں گا اور نہ ہی ہاکی کھیل سکوں گا تو زندگی کیسے بسر ہوگی۔

اُنہی دنوں ایک معروف ٹیکسٹائل ملز سے یہ اعلان سامنے آیا کہ اس ٹیکسٹائل ملز کے مالکان ملز کی فٹ بال اور ہاکی ٹیم بنانے کے لیے کوشاں ہیں اور اچھے کھلاڑیوں کو وظیفہ بھی دیں گے۔ چنانچہ میں نے اُنہیں خط لکھ دیا کہ میں آپ کی ملز کی ہاکی ٹیم کا رکن بننا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے اپنی ملز میں ''ویونگ سیکشن'' میں بطور ''اپرنٹس'' شامل کر لیں''۔ میں چاہتا تھا کہ بطور ''اپرنٹس'' اپنے تین سال پورے کر کے ان کی ملز میں وِیونگ ماسٹر کے طور پر کام کر سکوں۔ اُن دنوں ملک کے اندر کئی ٹیکسٹائل ملیں کھل رہی تھیں یہ کام نیا نیا تھا اور مستقبل میں ترقی کا خاصا امکان تھا۔ خط کا مثبت جواب ملنے پر میں نے بستر باندھا اور ملتان چلا آیا۔ یہاں پر والد صاحب کے ایک دوست کے کوارٹر میں رہائش کر لی۔ مل کے مالک سے اُن کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے مجھے کہا کہ ویونگ سیکشن میں تمہاری ٹریننگ تو دو ماہ کے بعد شروع ہوگی۔ اس عرصے میں تم میرے دفتر میں بطور کلرک کام کرو، ستّر روپے ماہانہ تمہارا وظیفہ مقرر کر دیا ہے تم ہاکی کھیلو اور فتر میں کام کرو۔ عنقریب تمہاری رہائش کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ چنانچہ دو ماہ تک میں دفتر میں کام کرتا رہا۔ اسی اثناء میں میری رہائش کا بھی انتظام ہو گیا۔ ایک کوارٹر تھا جس میں میرے ساتھ ایک فٹ بال کا کھلاڑی بھی رہائش پذیر تھا۔ ہم دونوں دوست بن گئے صبح کو دفتر اور شام کو گراؤنڈ۔ اس سے وہ پریشانی تو ختم ہوئی جس نے فراغت کی وجہ سے مجھے ہر طرح سے گھیر رکھا تھا۔ میں قدرے خوش بھی تھا کہ مستقبل میں ''ویونگ ماسٹر'' بھی بن جاؤں گا اور ہاکی کا شوق بھی پورا ہوگا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دو ماہ تو بڑے آرام سے گزر گئے لیکن جب دفتر سے ملز کے اندر ''ویونگ سیکشن'' میں کام کرنا شروع کیا تو دن کو تارے نظر آنے لگے۔ ''ویونگ سیکشن'' کے اندر کی مخصوص فضا نے مجھے بیمار کر دیا کچھ ہی دنوں بعد کھانسی، نزلہ اور ہلکا پھلکا بخار۔ ساری

ساری رات کھانستا اور جاگتا رہتا اور پھر دن کو ڈیوٹی دیتا۔ یہ انتہائی مشکل دن تھے۔ صحت دن بدن گرتی جاتی تھی۔ میرروم میٹ جوفٹ بال کھلاڑی تھا اس نے مجھے کہنا شروع کر دیا کہ تم یہ کام چھوڑ کر گھر چلے جاؤ تمہیں ویونگ سیکشن کی بھاپ راس نہیں آئی اور اگر تم نے یہ کام نہ چھوڑا تو تمہیں ٹی بی ہو جائے گی۔ میں اپنی جگہ یہ سوچ کر خاموش رہتا کہ گھر جا کر گھر والوں کو کیا جواب دوں گا۔ بہرحال ایک دن اُس نے زبردستی میرا بستر اور دوسرا سامان اٹھا کر مجھے لائل پور کی ٹرین پر سوار کرا دیا اور میں دوبارہ اپنے گھر لوٹ آیا۔ گھر والوں نے میرے حالت دیکھی تو ایک دفعہ تو کچھ نہ کہا لیکن کچھ دنوں کے بعد جب میری طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو پھر وہی مسئلہ درپیش تھا کہ اب کیا کرو گے۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں خود دوبارہ اُسی پریشانی میں مبتلا رہنے لگا جیسی پریشانی ملتان جانے سے پہلے تھی۔

اُمید کی کرن:

انہی دنوں جبکہ میں انتہائی پریشان تھا میں گورنمنٹ کالج کے ہاکی گراؤنڈ چلا گیا کہ وہاں اپنے دوستوں سے مل لوں گا اور اُنہیں ہاکی کھیلتے ہوئے دیکھوں گا تو جی بہل جائے گا۔ یہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد غالباً ستمبر ۱۹۵۳ء کی بات تھی ان دنوں تمام کھیل اپنے جوبن پر ہوتے ہیں۔ جب میں گراؤنڈ پر پہنچا تو تمام ہاکی کے کھلاڑی جو مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ انہوں نے یکدم شور مچا دیا ''شبّیر آ گیا، شبّیر آ گیا'' ابھی گیم شروع نہیں ہوئی تھیں وہ سارے کھلاڑی میرے اردگرد کھڑے ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں نے اُنہیں اپنی ساری کہانی کہہ سنائی تو وہ کہنے لگے کہ اس میں اتنی پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تم ہمارے کالج میں دوبارہ فسٹ ائیر میں داخلہ لے لو۔ میں نے جواب میں کہا کہ چودھری غلام رسول وڑائچ مجھے قبول کر لیں گے؟ (چودھری صاحب گورنمنٹ کالج میں ڈائریکٹر فزیکل ایجوکیشن (D.P.E) تھے۔ اور وہی کالج کی ہاکی ٹیم کے انچارج اور کوچ بھی تھے) ہاکی کے لڑکوں نے جواب میں کہا کہ تم فکر نہ کرو ہم تمام چودھری صاحب کو تمہارے کالج داخلے کے لیے قائل کر لیں گے۔ دوسرے روز مجھے لڑکوں نے کالج بُلا لیا اور کالج میں چودھری صاحب سے میری ملاقات کرا دی۔ چودھری صاحب سے ملاقات کے دوران میں تو شرمندہ رہا۔ لیکن وہ مسکرا کر میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ مجھے کہا کہ تم نے تو ہمیں چھوڑ دیا تھا۔ پھر کیا تم وہاں جا کر خراب نہ ہوئے۔ اب اگر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو ہم تمہیں دوبارہ کالج میں خوش آمدید کہتے ہیں لیکن بطور سزا تمہاری فیس ابھی معاف نہیں ہو گی اور داخلہ کی فیس تمہیں پوری ادا کرنا پڑے گی میں اس پر بھی بہت خوش ہوا۔ گھر آ کر ساری بات اپنے والد صاحب کی بجائے اپنی والدہ صاحبہ سے کہہ دی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اب داخلہ کی رقم کہاں سے آئے گی جو اُس وقت دو ڈھائی سو روپے کے قریب تھی۔ والدہ صاحبہ اللہ اُنہیں غریقِ رحمت کرے نے فوراً اپنے کانوں سے سونے کے کانٹے اُتار

کر میرے حوالے کر دیے اور کہا جاؤ اُنہیں بازار میں بیچ کر کالج میں داخل ہو جاؤ۔ میں انتہائی خوشی کے ساتھ مولانا عبید اللہ احرار کے بیٹے سیف صاحب کی دکان جو سونے کے زیوروں کا کام کرتے تھے کے پاس وہ کانٹے فروخت کر دیے اور تین سو روپے کی رقم وصول کر کے دوسرے روز کالج چلا گیا۔ داخلہ فیس دے کر چودھری صاحب کے پاس آ گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ بس اب تم دوبارہ اپنی تعلیم شروع کرو اور ہاکی کھیلو۔ فیس کی معافی بھی اپنے وقت پر ہو جائے گی۔

کالج لائف:

یہ ستمبر ۱۹۵۳ء تھا جب میں دوبارہ گورنمنٹ کالج فسٹ ائیر میں داخلہ ہوا۔ کالج میں داخل ہوئے ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ میں نے اپنے اردگرد کئی ہم مزاج ساتھی اکٹھے کر لیے اور ایک مربوط دوستوں کا حلقہ بنا لیا۔ جن کی وجہ سے میں نے کالج کے اندر اپنی چار سالہ مدت (۵۷۔۱۹۵۳ء) اتنی آسائش اور خیال افروز انداز سے گزاری جس پر آج بھی تصور میں مجھے رشک آتا ہے۔ کالج میں ہاکی بھی کھیلی، تقریریں بھی کیں۔ یونین کے الیکشن بھی لڑے اور کئی دیگر معرکے بھی سر کیے۔ میری کالج کی زندگی کے اس طرح بسر ہونے میں زیادہ تر میری اُن صلاحیتوں کا ہاتھ تھا جو مجھے مجلس احرار اسلام کی تربیت کی وجہ سے میّسر آئیں۔ خود اعتمادی، جرأت، بے باکی اور اپنے اردگرد سلجھے ہوئے اور فعال لوگوں کی اکٹھا کر لینا میرے لیے زندگی کے ہر مرحلے میں انتہائی آسان اور سہل کام رہا ہے۔ آپ اس بات کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ ہم دوستوں نے فسٹ ائیر میں اپنے سینئر لڑکوں کو ''فول'' کیا۔ کالج کے لڑکے حیران تھے کہ ''یہ گروپ'' کہاں سے نازل ہوا ہے جو فسٹ ائیر میں بھی اپنے سینئر لڑکوں کو مذاق کرتا ہے۔ اس حلقہ دوستاں میں کئی ایسے لڑکے شامل تھے جو بعد میں بڑے اہم عہدوں تک پہنچے۔ مثلاً زاہد سرفراز جو ہماری اس منڈلی میں سب سے زیادہ شرمیلا لڑکا تھا بعد میں سیاست میں اُس نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے، دو دفعہ وفاقی وزارت کے منصب تک پہنچا۔ ایک دفعہ وفاقی وزیر داخلہ رہا اور ایک مرتبہ وفاقی وزیر تجارت پھر ان دوستوں میں میاں اکبر بھی تھے جو یونیو بورڈ پنجاب کے سینئر رکن رہے۔ عبدالستار خان زرعی کالج میں پڑھاتے رہے۔ یونس چودھری جو ایڈووکیٹ بن کر پیپلز پارٹی کے فیصل آباد میں پہلے جنرل سیکرٹری بنے، غلام رسول شوق پنجابی کے معروف شاعر اور نثر نگار کے طور پر مشہور ہوئے۔ زاہد سرفراز کے بڑے بھائی خالد سرفراز جنہوں نے لندن سے بیرسٹری کی۔ ایسے کئی دوسرے ہم جولی جن کا ذکر آگے آتا رہے گا ہمارے دوستوں کے حلقے میں شامل تھے۔ رفتہ رفتہ چند سینئر لڑکوں کی شراکت سے ہمارا حلقہ دوستاں زیادہ وسیع ہوا۔ اس میں تھرڈ ائیر اور فورتھ ائیر کے لڑکے بھی شامل تھے۔ بابا یونس جو کہ فورتھ ائیر کا طالب علم تھے اور عمر میں سب سے بڑے تھے اُس کے ساتھ کئی لڑکے جن کا تعلق سرگودھا سے تھا وہ بھی ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے ہم نے ''قوم'' کے نام سے ایک زبردست گروپ بنا لیا۔ بابا یونس کو بابائے

قوم کا خطاب دیا وہ ہمارے حلقے میں اسی نام سے پکارے جاتے تھے۔اسی وجہ سے بہت ہی کم عرصے میں پورے کالج کے لڑکوں سے تعارف ہو گیا۔مہر فیروز ڈاہر میرے سکول کا ساتھی اور دوست بھی اس گروپ کا ایک فعال فرد تھا۔ہمارے علاوہ بھی کالج میں لڑکوں میں ایک دوسرا گروپ بھی تھا۔جس نے کسی حد تک ہمارے لیے ایک حریف گروپ کا کردار ادا کیا۔ ہمارے اس گروپ کے معروف لڑکے آغا افضال اور آغا ناصر دو بھائی جو بیگم جی۔اے خان کے بھانجے تھے۔اس کے علاوہ ایک نام اقبال فیروز کا بھی ہے جو محفل ہوٹل چنیوٹ بازار کے مالک تھے ہیں اور ایک معروف نام مختار رانا کا تھا۔لیکن یہ وہ مختار رانا نہیں جس کی شہرت پیپلز پارٹی کے حوالے سے تھی۔ بلکہ یہ مختار رانا جھنگ بازار والے کہلاتے تھے۔کالج میں ایک تیسرا گروپ اُن لڑکوں کا بھی تھا جسے ہم ''پڑھاکو'' گروپ کہتے اُس میں بڑے لائق طالب علم تھے۔جن میں محمد یعقوب جو بعد میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر کے منصب تک پہنچے۔صدیق شبلی، جنہوں نے بعد میں ایران سے فارسی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اوپن یونیورسٹی میں اہم عہدے پر فائز رہے۔غلام محی الدین جنہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور فیصل آباد میں وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے اور ایک نامور وکیل کی حیثیت میں اب تک کام کر رہے ہیں۔مظہر حسین شیخ نے معاشیات میں ایم۔اے کیا، مقصود اور غلام حیدر چشتی جنہوں نے عربی میں ایم۔اے کر کے ہمارے ہی کالج میں بطور پروفیسر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔یہ گروپ ہمیں شرارتی گروپ کہتا اور ہم سے ہمیشہ ہی دور رہا ہم نے بھی انہیں کبھی منہ نہیں لگایا۔لیکن بی۔اے میں ہم دونوں گروپ ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور اس گروپ کے ساتھ بھی ہمارے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔

پرنسپل اور کالج سٹاف:

جب میں نے دوسری بار ستمبر ۱۹۵۳ء میں داخلہ لیا تو اُس وقت کالج کے پرنسپل ملک کے معروف سکالر تاج محمد خیال تھے۔انتہائی ہر دل عزیز شخصیت تھے۔لڑکوں میں اُن کے لیے غیر معمولی احترام تھا۔کالج میں ہی پرنسپل ہاؤس میں رہائش پذیر تھے۔اچکن اور چُوڑی دار پاجامے میں اُن کی شخصیت مزید متاثر کرتی تھی۔ ہر لڑکا اُنہیں دل و جان سے چاہتا تھا اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔کھلاڑیوں کے قدر دان تھے۔کئی دفعہ اُن سے ملاقات ہوئی۔ ہر دفعہ اُن کی عزت و احترام میں اضافہ ہی ہوا۔ پرنسپل کے علاوہ چند دوسرے پروفیسروں میں پروفیسر واسطی (تاریخ)، پروفیسر اکرام بٹ (تاریخ)، پروفیسر افتخار چشتی (اسلامیات)، پروفیسر منیر چودھری (معاشیات)، پروفیسر شور علیگ (فارسی)، پروفیسر خواجہ کرامت (انگریزی)، پروفیسر ظہیر قریشی (انگریزی)، اے آر آصف (انگریزی) اور پروفیسر رضوی کے نام اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔اردو میں ایک اور نام پروفیسر مرزا محمد منور کا بھی ہے جو بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے اور

اقبالیات کے حوالے سے بھاری بھرکم علمی سرگرمیوں کے حوالے سے معروف ہوئے۔ پھر ن،م راشد کے چھوٹے بھائی راجہ ایف، ایم ماجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن سے میں نے بی۔اے میں پولیٹیکل سائنس اور ایم۔اے میں ''مسلم پولیٹیکل تھاٹ'' (Muslim Political Thought) پڑھا۔ میرے پسندیدہ استاد تھے۔ جنہوں نے اپنے حُسنِ سلوک اور اپنی قابلیت سے مجھے متاثر کیا۔ اُس وقت پورے شہر میں ہمارے پرنسپل تاج محمد خیال کی قابلیت، متانت، سنجیدگی اور اُن کی شرافت کا شہرہ تھا اور شہر میں منعقد ہونے والی ادبی و علمی تقریبات میں اُنہیں مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا جاتا تھا۔ اُن کی تقریر میں علمیّت کے ساتھ ساتھ اُن کے لہجے کی نرمی اور الفاظ کی چاشنی کانوں میں رس گھولتی اور خیالات میں وسعت پیدا کرتی تھی۔ ہمارے الحاج چودھری غلام رسول ڈی پی ای کے تاج محمد خیال صاحب کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب گجرات میں زمیندار کالج کا آغاز ہوا تو حکومت نے ان دنوں کو ڈپوٹیشن پر گجرات کالج میں بھیج دیا تھا۔ اور جب وہ کالج اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو ان دونوں کو واپس گورنمنٹ کالج لائل پور بھیج دیا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا تھے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے پر بے پناہ اعتماد تھا۔ دونوں کے درمیان کالج کی بہتری اور اس کی ترقی کے لیے بے مثال تعاون تھا۔ جسے ہمارے کالج کے چند پروفیسر زیادہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ باہمی تعاون تھا جبکہ دوسری وجہ چودھری غلام رسول ڈی پی ای کی اپنی مقناطیسی شخصیت بھی تھی، چودھری صاحب بڑا اچھا لباس پہنتے تھے۔ اپنے فرائض کو انتہائی ذمّہ داری سے سرانجام دیتے۔ گورنمنٹ کالج کی ہاکی فٹ بال کی ٹیموں کو نئے سرے سے ایک ایسے مقام پر لے آئے کہ پورے پنجاب میں ان ٹیموں کا اعلیٰ پایہ تسلیم کیا جانے لگا۔ گورنمنٹ کالج کی ٹیمیں ہمیشہ زرعی کالج سے ہار جاتی تھیں چودھری صاحب کی محنت کا نتیجہ تھا کہ اب گورنمنٹ کالج کی ٹیموں کا معیار زرعی کالج سے کہیں بہتر ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کالج کے تمام کھلاڑی چودھری صاحب کو جو عزت اور احترام دیتے وہ ان پروفیسروں کو نہیں ملتا تھا جس کے وہ خواہش مند تھے۔ اُن میں سے بعض پروفیسر تو اپنے طالب علموں سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ جبکہ چودھری غلام رسول لڑکوں کے ساتھ بعض اوقات طویل مکالمات کرتے اور اُنہیں اخلاقیات کی تربیّت، باہمی تعلقات، عملی زندگی کی مشکلات اور اُن پر قابو پانے کے لیے عزم و ہمت کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ یہ تفصیلات اس لیے بھی ضروری ہیں کہ آئندہ آنے والے بعض واقعات کا تعلق اس پس منظر سے وابستہ ہے۔

پڑھنا:

میں نے سالِ اول میں جو مضامین لیے تھے ان میں فلسفہ کا مضمون بھی تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ، اسلامیات اور معاشیات کے مضامین بھی میں نے رکھ لیے۔ پہلے دن جب میں فلسفہ پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں گیا تو فلسفہ کے

پروفیسر صاحب نے اپنے پہلے ہی لیکچر میں یہ کہہ دیا کہ جس طالب علم کا ذہن دینی ہو وہ فلسفہ نہ پڑھے اس پر میں کچھ پریشان سا ہو گیا کہ میں نے محسوس کیا کہ میں تو ایک دینی ذہن کا طالب علم ہوں اور پروفیسر صاحب مجھے ہی کہہ رہے ہیں کہ میں فلسفہ چھوڑ کر کوئی اور مضمون رکھ لوں۔ پریشانی تو ہوئی تاہم میں فلسفہ ہی پڑھتا رہا چند دنوں کے بعد ہی پروفیسر صاحب نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر ایک لیکچر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان بندر سے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا انسان بنا۔ میرے لیے تو یہ فلسفہ ایک بالکل نیا تھا اور میں یہ سن کر حیران بھی ہوا اور کلاس میں بیٹھے بیٹھے کچھ سوچتا رہا کہ یہ کیا بات ہے اور یہ کیسے ممکن ہے۔ جب پروفیسر صاحب نے اپنا لیکچر ختم کیا تو میں نے کھڑے ہو کر اپنے پروفیسر صاحب سے پوچھا کہ ایک سوال میرے ذہن میں آیا ہے آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اُنہوں نے کہا کہ ہاں وہ کیا سوال ہے پوچھو تو میں نے کہا کہ:

سر آپ نے کہا ہے کہ انسان اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے بندر سے انسان بنا ہے تو اس پر میرا سوال یہ ہے کہ آج جو بندر اس وقت تک ہیں۔ اُنہوں نے اتنی ترقی کیوں نہیں کی اور وہ کیوں آج تک بندر ہیں۔ اور ہم انسان جو آج ترقی کر کے بندر سے انسان بن گئے ہیں مستقبل میں آگے ترقی کر کے کوئی اور مخلوق بن جائیں گے یا پھر انسان ہیں رہیں گے۔''

جب میں نے یہ سوال کیا تو پورے کمرے میں سناٹا تھا۔ ہر لڑکا میری بات کو غور سے سن رہا تھا اور مجھے اُن کے چہروں سے یہ تاثر مل رہا تھا کہ ان میں سے ہر لڑکا یہی جاننا چاہتا ہے جو میں نے پروفیسر صاحب سے پوچھا ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے اس کا مجھے صرف یہی جواب دیا کہ:

''کل سے آپ فلسفہ پڑھنے نہیں آئیں گے آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ فلسفہ چھوڑ کر کوئی اور مضمون رکھ لیں''

اس کے بعد میرے لیے سوائے اس کے اور کیا چارہ کار تھا کہ میں نے فلسفہ چھوڑ کر اس کی جگہ فارسی رکھ لی اور دل کے بہلانے کو یہ سوچا کہ چلو کیا فرق پڑتا ہے فلسفہ بھی ''ف'' سے شروع ہوتا ہے اور فارسی بھی ''ف'' سے ہی شروع ہوتی ہے کم از کم ''ف'' تو دونوں مضامین میں مشترک ہے ہی۔

پروفیسر شور علیگ کے ساتھ پہلی گفتگو:

پروفیسر شور علیگ اپنی شاعری کی وجہ سے نہ صرف پورے پاکستان بلکہ برصغیر بھر میں مشہور و معروف شخصیت تھی۔ کئی حوالوں سے اُن کی طرزِ زندگی، دوسرے پروفیسروں سے مختلف تھی۔ نہ تو طالب علموں گفتگو کرتے اور نہ ہی اپنے ساتھی پروفیسروں سے بے تکلف ہوتے تھے بس اُن کی اپنی ہی ایک دنیا تھی جس میں کھوئے کھوئے رہتے۔ گفتگو مختصر اور بوقتِ ضرورت ہی کرتے۔ ایک دن اُن کی کلاس میں میرا تعارف بڑے عجیب طرح سے ہوا۔ وہ پڑھا رہے تھے اور پڑھاتے ہوئے اپنے آپ میں ایسے محو تھے کہ ہماری توجہ اُن کے لیکچر کی بجائے اُن کی محویّت کی طرف زیادہ تھی۔ پڑھاتے

ہوئے اُنہوں نے کسی قاعدے کی مثال میں اپنا ہی اردو کا ایک شعر کہہ دیا اور میں اس وقت یہ بھول چکا تھا کہ میں کلاس میں اپنے استاد کے سامنے بیٹھا ہوں اُن کا لیکچر سُن رہا ہوں بلکہ میں نے اُس شعر کی ایسے داد دی کہ جیسے میں مشاعرہ میں بیٹھا کسی شاعر کی غزل سن رہا ہوں۔ بس میں نے اُن کے شعر پر داد کیا دی کہ میری شامت آ گئی۔ انتہائی خفا ہو گئے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا آنکھوں سے غضب ٹپکنے لگا۔ غصے میں بولے یہ کس نے داد دی ہے؟ اب کلاس خاموش۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ اُنہوں نے اندازہ لگا کر کہ آواز بصورت داد کہاں سے آئی ہے میرے ساتھ بیٹھے میرے دوست عبدالستار کو اٹھا لیا اور اُنہیں کہنے لگے کہ اپنا نام اور رول نمبر بتاؤ۔ میں ابھی ''بلیک لسٹ'' میں تمہارا نام درج کرتا ہوں اُن دنوں ''بلیک لسٹ'' طالب علموں کے لیے ایک بہت بڑی سخت وارننگ تھی۔ جس لڑکے کا نام ''بلیک لسٹ'' میں شامل ہو جاتا پھر اُس کے بعد اُس طالب علم سے ذرا سی بھی ایسی حرکت ہو جاتی جو کالج کے نظم کو مجروح کرنے والی ہوتی تو اُسے کالج سے ہی خارج کر دیا جاتا تھا۔ اب عبدالستار بے چارہ کہے جا رہا تھا کہ:

''سر میں نے داد نہیں دی اور وہ پریشانی میں میرے نام کے ساتھ جناب لگا کر اُنہیں کہہ رہا تھا کہ جناب شبیر نے داد دی ہے''

لیکن شور صاحب عبدالستار کی بات نہیں مان رہے تھے اور متواتر عبدالستار کا نام اور رول نمبر پوچھ رہے تھے۔ اس پر میں اُٹھ کر کھڑا ہوا اور میں نے شور صاحب کو عرض کیا کہ:

''سر یہ گستاخی اور بے ادبی مجھ سے سرزد ہوئی ہے عبدالستار سے نہیں ہوئی اس لیے اگر آپ نے بلیک لسٹ کرنا ہے تو مجھے کریں کہ میں ہی اس کا قصوروار ہوں عبدالستار خان نہیں ہے۔''

میرے یہ کہنے سے پروفیسر صاحب بڑے حیران ہوئے اور میرے قریب آ کر اپنی وہی پنسل جس سے وہ عبدالستار کا نام اور رول نمبر لکھنا چاہتے تھے۔ میرے پیٹ میں چبھو کر مجھے کہنے لگے:

''کریکٹر کے معلوم ہوتے ہو، کریکٹر..... کے اس دفعہ معاف کرتا ہوں، آئندہ ایسی حرکت ہوئی تو معافی نہیں ہوگی۔ کیا نام ہے آپ کا؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے شبیر کہتے ہیں۔ یہ تھا وہ تعارف جو بعد میں مجھے شور صاحب کے بہت قریب لے آیا۔ جس کا ذکر متعدد مواقع پر آئے گا۔

سرور اعوان:

جب میں کالج میں داخل ہوا تو اس وقت سرور اعوان کالج سٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے۔ کالج ہاکی ٹیم کے کھلاڑی بھی تھے اور ''ان سائیڈ لفٹ'' کی پوزیشن پر کھیلتے تھے۔ کالج میں اُن کا ایک منفرد مقام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کی

صدارت میں کالج کے اندر ایک بین کلیّاتی مباحثہ بھی ہوا۔ جس کی صدارت بطور صدر سٹوڈنٹ یونین اُنہوں نے کی تھی، پورے صوبے کے مختلف کالجوں کے مقررین نے اس مباحثے میں شرکت کی تھی۔ جن میں ارشد کاظمی اور دوسرے معروف مقررین اپنی خطابت کے جوہر دکھائے۔ مباحثے کا عنوان ''تمیزِ بندہ وآقا فسادِ آدمیّت ہے'' تھا۔

سرور اعوان نے اس مباحثے کے دوران اپنی صلاحیتوں کا ویسے ہی مظاہرہ کیا جیسے وہ ہاکی کے میدان میں اپنے معیاری کھیل کے ذریعے کرتے تھے۔ بعد میں جب وہ بی۔اے کر چکے تو اُنہوں نے کسٹم کے شعبے میں ملازمت کر لی۔ کسٹم کی طرف سے نیشنل ہاکی چیمپئن شپ میں بھی کھیلتے رہے۔ کسٹم کی نوکری سے فارغ ہوئے تو کراچی کے ہی ہو کے رہ گئے اور ایک لمبے عرصے تک کراچی کے پنجابی ایکٹوسٹوں کے رہنما کے طور پر پورے ملک میں مشہور ہو رہے۔ کالج میں اُن کے قریبی دوست شفیق بٹ تھے۔ اُنہیں بھی ہاکی کھیلنے کا شوق تو تھا لیکن کالج ٹیم میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ شفیق بٹ نے لاکا امتحان دے کر فیصل آباد میں پریکٹس شروع کی اور میرے دوستوں میں تاحیات شامل رہے۔

یونیورسٹی میچ:

یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ میں ہماری ہاکی ٹیم کی کارکردگی اُس سال بڑی اچھی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی جس کی حد کوئٹہ تک تھی اُسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ایک لاہور زون جس میں لاہور کے تمام کالجوں کی ٹیمیں شرکت کرتی تھیں۔ ایک راولپنڈی زون جس میں سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور راولپنڈی اور اس کے علاوہ دوسرے شہروں کی ٹیمیں شرکت کرتی تھیں۔ اور تیسرے زون میں فیصل آباد سے لے کر کوئٹہ تک کے کالجوں کی ٹیموں کے درمیان میچ ہوتے تھے۔ یہی زون ہمارا دائرۂ عمل تھا۔ ان تینوں زون کی فاتح ٹیموں کے درمیان پھر میچ ہوتے تھے اور جو ٹیم ان میں فاتح ٹھہرتی وہ یونیورسٹی چیمپئن کہلاتی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں جب ٹورنامنٹ شروع ہوا تو ہماری ہاکی ٹیم نے زرعی کالج اور گورنمنٹ کالج ساہیوال کی مضبوط ٹیم کو شکست دے کر ٹورنامنٹ میں اپنی پوزیشن کو مضبوط بنا لیا تھا۔ اب اس کے بعد ہم اُن تین ٹیموں میں شامل ہو گئے، اب ہمیں اسلامیہ کالج لاہور اور گارڈن کالج راولپنڈی کی ٹیموں کے ساتھ میچ کھیلنا تھا۔ گارڈن کالج کے ساتھ میچ کھیلنے کے لیے ہمیں راولپنڈی جانا تھا چنانچہ ہم نے راولپنڈی جا کر وہ میچ بھی جیت لیا۔ اور اب یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ کا فائنل اسلامیہ کالج لاہور سے کھیلنا تھا۔ جو ایک بہت ہی معیاری اور مضبوط ٹیم تھی۔ جس میں نسیم سنٹر فارورڈ، ذکاء الدین ان سائیڈ رائٹ اور جمیل ان سائیڈ لفٹ کی پوزیشن پر کھیلتے تھے اور یہ تینوں لڑکے اُس وقت پاکستان ٹیم کے چناؤ کے لیے اُس وقت پاکستان ٹیم کے کیمپ میں تھے۔ جن سے پاکستان کی ہاکی ٹیم کا فائنل چناؤ ہونا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور کی ٹیم کتنی مضبوط تھی اور پھر اس ٹیم کے فل بیک بھی رمضان اور دل دار جیسے معروف کھلاڑی تھے یعنی

اس ٹیم کا دفاع بھی بہت مضبوط تھا اور فارورڈ لائن بھی انتہائی مضبوط اور مؤثر تھی۔

چودھری صاحب نے اس میچ کی تیاری کے لیے خصوصی کوششیں شروع کر دیں۔ نماز فجر کے بعد تمام کھلاڑیوں کو پی۔ ٹی کے لیے روزانہ بلا لیا جاتا۔ بیس سے پچیس منٹ تک یہ انتہائی شدید ورزش کا سیشن ہوتا تھا۔ جس میں ہم انتہائی تھک جاتے تھے۔ یہ پی۔ ٹی اتنی سخت ہوتی کہ ہم روزانہ کھیلنے والے بھی اس پی۔ ٹی سے گھبراتے تھے۔ ایک روز ہماری ٹیم کے سنٹر ہاف اختر تو پی۔ ٹی کے دوران بے ہوش بھی ہو گئے تھے اُنہیں ہوش دلایا گیا تو ہوش میں آتے ہیں بے ساختہ جوان کے منہ سے نکلا وہ اب تک مجھے یاد ہے کہنے لگا:

''مجھے تو ماں کہتی تھی کہ بیٹا پی ٹی کرنے نہ جانا''

پی ٹی کے دوران ہم تو ''کِٹ'' میں ہوتے ہی تھے۔ لیکن چودھری غلام رسول ڈی۔ پی۔ ای بھی ''پراپر کٹ'' میں ہوتے باقاعدہ نیکر پاؤں میں فلیٹ، جرسی وغیرہ پہن کر آتے تھے۔ پی ٹی کے بعد وہ ہمیں کالج کنٹین میں لے جاتے اور ہر کھلاڑی کو آدھ سیر دودھ اور دو ابلے ہوئے انڈے کھلاتے تو صبح کی پی ٹی پریڈ ختم کر کے گھر آنے کی اجازت ملتی اور شام کو گراؤنڈ میں بھی وہ خود موجود ہوتے تھے، دو دو گھنٹے تک ہمارا پریکٹس کا پیریڈ جاری رہتا تھا۔

اسلامیہ کالج لاہور سے یونیورسٹی ٹورنامنٹ کا فائنل میچ:

آخر وہ دن آ گیا جس کے لیے ہم نے انتہائی محنت کی تھی۔ اسلامیہ کالج لاہور کی ہاکی ٹیم جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے انتہائی مضبوط تھی۔ لیکن ہماری ٹیم بھی کسی حوالے سے اُن سے کم نہیں تھی، اُن کے ''انٹرٹریک'' میں اگر ذکاء الدین جو بعد میں پاکستان کی ہاکی ٹیم میں برسوں ''ان سائیڈ رائٹ'' پوزیشن پر کھیلتے رہے تھے تو ہماری ٹیم میں بھی سیف لودھی شہید (۱۹۶۵ء کی جنگ میں انہوں نے بطور پائلٹ شرکت کی تھی اور شہید ہو گئے تھے) اور سرور اعوان جیسے پلیئر تھے جو بڑی سے بڑی مضبوط دفاعی لائن کو توڑ کر گول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ گول میں میاں خان ایک معیاری گول کیپر تھے، خوشی محمد اور ظفر بڑے مضبوط ''فل بیک'' جبکہ میں ''رائٹ ہاف اور احسان ''لفٹ ہاف'' کی پوزیشن اور اختر سنٹر ہاف تھے۔ ہمارے ''آؤٹ سائیڈ رائٹ'' اشرف، ''ان سائیڈ رائیٹ'' سیف لودھی، سنٹر فارورڈ بشیر، ان سائیڈ سرور اعوان اور ''آؤٹ سائیڈ لفٹ'' ظفر ہر لحاظ سے معیاری کھلاڑی تھے۔ میچ کے دوران پورا گراؤنڈ شہریوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں تل دھرنے کی جگہ خالی نہیں تھی پورا شہر جیسے یہ میچ دیکھنے کے لیے چلا آیا ہو۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ بڑا معیاری میچ ہوا لیکن پہلے دن ''ایکسٹرا ٹائم'' کے باوجود بھی میچ برابر رہا۔ یونیورسٹی کے ریفریوں نے میچ دوسرے دن کھیلنے کا اعلان کر دیا۔ دوسرے دن پھر وہی صورت حال تھی زبردست میچ ہوا لیکن اس دن ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور میچ اسلامیہ کالج لاہور کی ٹیم نے دو ایک سے جیت لیا۔

افسوس تو ہوا مگر چونکہ ہم کھیل کر ہارے تھے اس لیے لوگوں نے ہمیں بھی اسی طرح داد دی جس طرح وہ لاہور کے کھلاڑیوں کو مبارک دے رہے تھے۔ میرے خیال میں یہ میچ گورنمنٹ کالج کی تاریخ میں ایک اہم میچ کے طور پر یاد کیا جاتا رہے گا۔ ہم اگرچہ پنجاب یونیورسٹی ہاکی چیمپئن نہ بن سکے لیکن ''رنراپ'' کا اعزاز ہمیں حاصل ہوا۔ جو گورنمنٹ کالج کو اپنے ہاکی کے میدان میں پہلی دفعہ ملا۔ کہ ہم یونیورسٹی آف پنجاب میں دوسرے نمبر کی ہاکی ٹیم قرار دیے گئے۔ اب یونیورسٹی میچ تو ختم ہو گئے لیکن یونیورسٹی ٹیم کے چناؤ کے لیے پنجاب یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں ہاکی ''ٹرائل'' شروع ہو گئے۔ تین دن تک ٹرائل ہوتے رہے۔ کالج والوں نے میرا نام بھی یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے ٹرائل کے لیے بھیجا اور میں یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے لیے بھی منتخب ہو گیا۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا کہ میں فسٹ ائیر میں ہی یونیورسٹی ہاکی ٹیم کا رکن بن گیا اور اس پر مجھے اپنے کالج کی طرف سے ''رول آف آنر'' کا سرٹیفکیٹ عطا کیا گیا۔ پھر میں پورے چھے سال تک پنجاب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے رکن کی حیثیت میں انٹر یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ کھیلتا رہا اور پھر ۵۹۔۱۹۵۸ء میں، میں نے پنجاب یونیورسٹی ہاکی ٹیم کی قیادت کی اور اس پر مجھے گورنمنٹ کالج لاہور کی طرف سے بھی ''رول آف آنر'' کی سند عطا کی گئی۔ اس سال (یعنی ۵۹۔۱۹۵۸ء) میں انٹر یونیورسٹی ہاکی ٹورنامنٹ جام شورو (سندھ) کے ہاکی میدان میں ہوا تھا اور اس ٹورنامنٹ میں طارق عزیز جو بعد میں پاکستان ہاکی ٹیم کے رکن کی حیثیت سے کھیلتے رہے اور جن کی قیادت میں ایک دفعہ ورلڈ اولمپک میں پاکستان کی ہاکی ٹیم چیمپئن قرار دی گئی تھی میری قیادت میں اس ٹورنامنٹ میں کھیلے تھے۔ (جاری ہے)

☆☆☆